سید محمد معاویہ بخاری

ہم کب سوچیں گے؟

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ چشم دید مناظر سے تشکیل پاتی اندوہناک کہانیاں الفاظ کے سانچے میں نہیں ڈھل پاتیں اور ان گنت واقعات قلم بند ہونے سے محض اس لئے رہ جاتے ہیں کہ ظلم و جبر کی بے جہت قدغنیں لکھنے والوں پر غلبہ حاصل کر لیتی ہیں؟ قرطاس و قلم کے مابین حائل ہوتی ان مشکلات بارے سنا تو ضرور تھا مگر عملی طور پر اس کا مشاہدہ گزشتہ تین ہفتوں میں تیزی سے ظہور پذیر ہوتے المناک حادثات کے دوران ہوا ہے۔ میں پوری دیانت داری سے اعتراف کرتا ہوں کہ بے حوصلگی اور شکستگی کے مہلک وار اتنے شدید تھے کہ جسم و جاں کی طنابیں جگہ جگہ سے کٹتی چلی گئیں اور اب صورت حال یہ ہے کہ سوچیں منتشر، اعصاب تھکن سے چور اور دل و دماغ رنج و الم کی کیفیتوں سے بوجھل ہیں۔ لال مسجد اور جامعہ حفصہ پر ہونے والی بارودی بارش کے بعد، سوات، شمالی وزیرستان، ڈیرہ اسماعیل خان، ہنگو، اسلام آباد، حب، میران شاہ اور کوہاٹ میں رونما ہوتے المناک واقعات کی کرچیاں آنکھوں میں اتنے زخم بنا چکی ہیں کہ سب کچھ دھندلا پڑتا جا رہا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اس کرب کا شکار میں تنہا نہیں ہوں۔ وطن کی محبت کے اسیر لاکھوں کروڑوں اور بھی ہیں۔ جنہیں محبت اور جنگ میں سب کچھ جائز ہونے کے فارمولے پر شدید اعتراض ہے۔ کسی کے دعوائے عشق پر کوئی اعتبار بے شک نہ کرے مگر یہ حقیقت اپنی جگہ مسلم ہے کہ بے ریا دلوں کے نہاں خانوں میں پنپتے پاکیزہ جذبوں کی سچائی جانچنے کا پیمانہ بھی کسی کے پاس نہیں۔ صرف حاملین جذبات کی روش دیکھ کر ہی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ عشق و محبت کے قافلے کہاں تک محیط اور کس سمت میں رواں دواں ہیں۔ بنیاد پرست، انتہا پسند، دہشت گرد اور عسکریت پسند، جنگجو، یہ وہ القابات ہیں۔ عہد جدید کی لغت جنہیں ایک قبیلۂ عشاق کی نشاندہی کے لئے بیان کرتی ہے مگر جدید لغت یہ بتانے سے کلی طور پر عاجز ہے کہ بے حیائی، عریانی و فحاشی کا جبری اہتمام کرنے اور کرانے والے کن القابات سے بلائے جا سکتے ہیں۔ نفاذِ دین کا مطالبہ آئینی و قانونی ہے یا نہیں؟ میڈیا اس پر بات نہیں کرتا نہ ہی مذہب بیزار حکومتی زعما اور نام نہاد مبصرین اس حوالہ سے کسی بحث کو درست تصور کرتے ہیں۔ نجم سیٹھی، عاصمہ جہانگیر، نجم الدین شیخ، اقبال حیدر اور اکرم سہگل جیسے روشن خیال اس بات پر مُصر ہیں کہ نفاذِ دین کا مطالبہ کرنے والی ہر آواز خاموش کرا دینا ہی قومی مفاد کا تقاضا ہے۔ وہ خوش ہیں کہ صدر جنرل پرویز مشرف نے لال مسجد اور جامعہ حفصہ کے مذہب پسندوں کے خلاف جارحانہ اقدامات کا فیصلہ کیا۔ ان کے خیال میں لال مسجد اور جامعہ حفصہ کی تباہی سے ایک طاقت ور پیغام اُن قوتوں تک پہنچ گیا ہے جو آئین پاکستان میں دین اسلام کی متعین شدہ حیثیت کے مطابق اس کے نفاذ کا پرجوش انداز میں مطالبہ کرتے ہیں۔ پاکستان کے روشن خیالوں کے مطابق دین کا معاملہ انفرادی حیثیت رکھتا ہے۔ اگر کوئی اس پر عمل پیرا ہونا چاہے تو ہوتا رہے مگر سرکاری سطح پر اس کے نفاذ کا مطالبہ جمہوری نظام کی نفی، آزادیٔ اظہار پر قدغن اور اپنے من چاہے مذہب و نظریہ پر عمل پیرا ہونے کے حق سے انحراف اور انسانی حقوق سلب کئے جانے کے مترادف ہے۔ لہٰذا اگر کوئی شخص یا گروہ آئین پاکستان کو بنیاد بنا کر نفاذِ اسلام کا مطالبہ کرتا ہے تو وہ قابل قبول ہرگز نہیں ہے۔ ۱۰ر جولائی کو اسلام

آباد میں رونما ہونے والے سانحے کے حوالہ سے کئی جھوٹی سچی کہانیاں گردش میں ہیں تاہم کوئی باشعور شخص بھی اس یک طرفہ ناہموار حکومتی مؤقف پر اعتبار کرنے کو تیار نہیں کہ سانحۂ جامعہ حفصہ ولال مسجد کے ذمہ دار صرف ہٹ دھرم و بے لچک غازی برادران ہی تھے۔ مولانا عبدالعزیز اور مولانا عبدالرشید غازی کا سب سے بڑا جرم کیا تھا؟ یہی نا کہ انہوں نے احکام اسلام کے نفاذ کو انفرادی معاملہ سمجھنے والے روشن خیال قبیلے کے باطل نظریات پر کاری ضرب لگائی تھی۔ حکومتی سرپرستی میں ہوتی میراتھن دوڑ، فیشن شوز، مخلوط محافل موسیقی، جابجا کھلتے قحبہ خانوں، ڈانسنگ ہالوں، مساج سنٹرز اور عریانی وفحاشی پھیلاتے دیگر کئی اداروں پر انہیں سخت اعتراض تھا اور اس کے ذمہ داروں کے خلاف مزاحمت کو وہ اپنا دینی حق اور فریضہ سمجھتے تھے۔ لال مسجد اور جامعہ حفصہ کی چار دیواری میں نابود ہو جانے والوں کے مزاحمتی طرزِ عمل سے اکثریت متفق نہیں تھی۔ اور نہ ہی مسجد و مدرسہ میں اسلحہ کی جمع بندی اور نمائش کو ہی کسی ہوشمند نے درست عمل قرار دیا تھا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ طرزِ عمل کی بے ترتیبی کیا ایسا بھیانک جرم تھا کہ اس کی پاداش میں آپریشن سائلنس ناگزیر ہو گیا تھا؟ حقیقت یہ ہے کہ انتہا پسندی کے عنوان سے دین مخالف قوتیں گزشتہ چھے برسوں سے جس محاذ آرائی کا اہتمام چاہتی تھیں۔ اس کے باقاعدہ افتتاح کا حکم نامہ ۱۰/جولائی کو جاری کر دیا گیا۔ جنوری ۲۰۰۷ء کے درمیان سات مساجد کی شہادت کا معاملہ باقاعدہ ایک سوچے سمجھے منصوبے کا حصہ تھا، سازش گروں کو بخوبی علم تھا کہ اس کا ردِعمل ضرور ہوگا، چنانچہ اسی ردِعمل کو بنیاد بنا کر ہی مہلت، ڈھیل یا مذاکرات کے جھولے جھلانے کا عمل دانستہ اختیار کیا گیا۔ سازش گر اچھی طرح جانتے تھے کہ لال مسجد و جامعہ حفصہ میں زیر تعلیم طلباء وطالبات کی اکثریت ان حرماں نصیب علاقوں سے تعلق رکھتی ہے جو گزشتہ چھے برسوں کے دوران صرف امریکی افواج کی زد پر ہی نہیں بلکہ واراون ٹیرر کے لنگر سے بندھی مجبور و بے بس پاک فوج کے نشانے پر بھی ہیں۔ اس کھیل کی بنت ہی ایسی رکھی گئی تھی کہ ایک واقعے کا ردِعمل دونوں جگہ برابر رونما ہو سکے۔ ہمیں یہ اعتراف کر لینا چاہئے کہ منصوبے کا ہر مرحلہ سازش گروں کی منشا کے مطابق ہی طے ہوتا رہا۔ حکومتی زعماء ابھی تک حقائق تسلیم کرنے کو تیار نہیں ہیں۔ لیکن الیکٹرانک میڈیا پر یہ بات سامنے آ چکی ہے کہ وزیراعظم شوکت عزیز نے ایک پریس بریفنگ کے دوران خود ارشاد فرمایا تھا کہ لال مسجد اور جامعہ حفصہ کے خلاف بھرپور آپریشن کی تیاری چھے ماہ پہلے ہی کر لی گئی تھی، لیکن مگرمچھ کے آنسو بہاتی معصوم صورت وزارتیں آخر وقت تک یہ راگ الاپتی رہیں کہ حکومت آپریشن کے بجائے مذاکرات سے تمام معاملات طے کرنا چاہتی تھی۔ لال مسجد اور جامعہ حفصہ کا قضیہ ختم ہوئے بھی دو ہفتے سے زائد عرصہ گزر چکا ہے لیکن ابھی تک سینکڑوں سوال تشنۂ جواب ہیں۔ کوئی حکومتی نمائندہ اس بات کو ماننے کے لئے تیار نہیں کہ پورے آپریشن کی نگرانی امریکی خفیہ ادارے کے ماہر شکاریوں نے کی تھی۔ ظل الٰہی کو اعلیٰ سطحی رابطوں کے ذریعہ بتایا جا رہا تھا کہ ہاتھ آیا شکار کسی محفوظ راستے سے نہیں نکلنا چاہئے۔ ملک کے نامور علماء کا وفد غازی عبدالرشید سے تقریباً تمام معاملات طے کر چکا تھا لیکن پس پردہ کام کرتی نادیدہ قوت نے ۱۱ گھنٹے طویل مذاکراتی محنت کو عین آخری چند لمحوں میں اکارت کر دیا۔ معتبر میڈیا ذرائع تصدیق کرتے ہیں کہ غازی عبدالرشید اپنے وفاداروں سمیت صبح ۱۰ بجے تک زندگی کی بازی ہار چکے تھے۔ لیکن ہولناک دھماکوں اور اندھی فائرنگ کا سلسلہ رات گئے تک جاری رہنے کی افواہیں پھیلائی گئیں۔ ''حامد میر'' اور ''طلعت حسین'' جیسے باخبر صحافی اپنے متعدد

پروگراموں میں جتنے حقائق منکشف کر چکے ہیں اس کے بعد وزارت مذہبی امور اور وزارت داخلہ کی من گھڑت کہانیوں پر یقین کرنا کسی کے لئے بھی ممکن نہیں رہا۔ دونوں صحافی اعتراف کرتے ہیں کہ غازی عبدالرشید نے رخت سفر باندھتے ہوئے آخری بیان میں اپنے پاس موجود اسلحہ اور طلباء وطالبات کی جو تعداد بتائی تھی اس کی سچائی ثابت کرنے کے لئے ہمارا نام نہاد آزاد میڈیا کوئی کردار ادا نہیں کر سکا۔ اس حوالے سے لکھنے اور بولنے والے ابھی تک دھمکیوں کی زد میں ہیں ان سے برابر کہا جا رہا ہے کہ مسجد و مدرسہ میں جنہیں مارا گیا وہ دہشت گرد تھے اور میڈیا پر دہشت گردوں کو بار بار دکھانا، ان کا تذکرہ کرنا انہیں ہیرو بنانے کے مترادف ہے۔ لہٰذا اس کرید اور تحقیق کو بند کیا جائے کہ مرنے والے کتنے تھے؟ ان کی لاشوں کو کس طرح اور کہاں دفنایا گیا؟ یہ بھی مت بتاؤ کہ جامعہ حفصہ کے فاتحین جب سب کچھ اپنے قدموں تلے روند چکے تھے تو اس وقت کتنے لوگ زندہ تھے۔ جنہیں جینے کی مہلت نہیں دی گئی۔ ابھی تک ان نامعلوم غیر ملکیوں کی تصدیق بھی نہیں ہو سکی جنہیں آپریشن سائلنس کی بنیاد قرار دیا گیا اور جن کے بارے میں ظلِ الٰہی نے ارشاد فرمایا تھا کہ دہشت گردوں کے ساتھ معاملات طے کئے جا سکتے اور نہ ہی حکومتی رٹ کو چیلنج کرنے والوں کو معافی دی جا سکتی ہے۔ مجھے نہیں معلوم کسی میڈیا نمائندے نے ان سے یہ پوچھنے کی جسارت کی یا نہیں کہ اگر قتل کے نامزد مجرموں پر عنایات خسروانہ ہو سکتی ہیں انہیں سنگین نوعیت کے مقدمات کے باوجود اعلیٰ عہدوں پر متمکن کیا جا سکتا ہے، اگر ایک ٹیکسی ڈرائیور کے قتل کے جرم میں سپریم کورٹ سے موت کی سزا پانے والے ''طاہر حسین'' کو Safe Passage (محفوظ راستہ) دے کر برطانیہ روانہ کیا جا سکتا ہے، اگر بھارتی حکومت اپنے ۶۰ مسافروں کی جان بچانے کے لئے مسعود ازہر جیسے انتہائی مطلوب شخص کو اس کے ساتھیوں سمیت رہا کر سکتی ہے تو کیا غازی عبدالرشید کے جرائم ایسے بھیانک تھے کہ ان کے ساتھ ایسا سلوک روا نہیں رکھا جا سکتا تھا؟ حکومتی زعماء دہائی دیتے رہے کہ ہم تمام طلباء وطالبات کی جانیں بچانا چاہتے ہیں مگر پھر دو ہزار میں سے ۱۳۰۰ کے قریب نکل آنے والے خوش نصیبوں پر ہی اکتفا کیوں کر لیا گیا اور کم وبیش سات سو طلباء طالبات کو دائرۂ انسانیت سے خارج کر دینے کی حکمت عملی کس شہہ دماغ نے مرتب کر ڈالی؟ اعجاز الحق، آفتاب شیر پاؤ، طارق عظیم، چوہدری شجاعت، وزیراعظم شوکت عزیز اور صدر پرویز مشرف تک 10 جولائی کی شب ہونے والے آخری فیصلہ میں کون کتنا بااختیار تھا اس کا اعلان پہلے امریکی سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کے نمائندے ''ٹام کیسی''، نائب وزیر خارجہ ''رچرڈ باؤچر'' اور پھر خود کنگ آف واراون ٹیرر ''جارج ڈبلیو بش'' نے کر دیا ہے۔

صدر مشرف، وزیراعظم شوکت عزیز اور وزیر خارجہ خورشید قصوری گو کہ وضاحتیں پیش کر رہے ہیں کہ لال مسجد کے حوالہ سے ہم پر کوئی بیرونی دباؤ نہیں تھا۔ ہم نے جو کچھ کیا اپنے ملکی اور قومی مفاد اور حکومتی رٹ قائم کرنے کے لئے کیا۔ اگر حکومتی موقف کو درست مان لیا جائے تو پھر ۱۱ر جولائی سے ۲۱ر جولائی تک امریکی انتظامیہ کی جانب سے صدر مشرف کو مسلسل تہنیتی پیغامات کیوں موصول ہو رہے ہیں؟ ۲۱ر جولائی کو اپنے ہفتہ وار ریڈیو خطاب میں صدر بش نے بات مزید واضح کر دی ہے کہ ''لال مسجد سمیت عسکریت پسندوں کے خلاف پاکستان کی کارروائیاں امریکی مہم کا حصہ ہیں۔ پاکستان سے انتہا پسندی اور قبائلی علاقوں سے القاعدہ کی محفوظ پناہ گاہوں کے خاتمے کے لئے صدر مشرف کی کوششوں کی بھرپور حمایت کرتے ہیں۔'' (روزنامہ اسلام ۲۲ر جولائی ۲۰۰۷ء)

گزشتہ سات برسوں سے اس ملک اور قوم کے ساتھ ایک خطرناک کھیل کھیلا جا رہا ہے اور جو لوگ اس کھیل کے تمام

ہلاکت آمیز پہلوؤں سے بہت پہلے آگاہ تھے۔ وہ دہائی دیتے رہے کہ پاکستان کو بھی عراق بنانے کی سازش کی جارہی ہے۔ انہوں نے کہا تھا کہ امریکہ اپنے مذموم مقاصد کی تکمیل کے لئے پاکستان میں ایک فوجی حکمران کو صرف اس لئے برسر اقتدار دیکھنا چاہتا ہے تاکہ وہ اس کے ہاتھ میں طاقت کا چابک دے کر پوری قوم کو بھیڑ بکریوں کی طرح ناہموار راستوں پر اندھادھند ہانک سکے۔ لیفٹیننٹ جنرل ریٹائرڈ حمید گل، لیفٹیننٹ جنرل ریٹائرڈ اسد درانی، جنرل مرزا اسلم بیگ، بریگیڈیئر ریٹائرڈ عبدالرحمٰن، جنرل نصیراللہ بابر جیسے عسکری ماہرین کے علاوہ دیگر کئی اہل رائے حضرات برملا کہہ رہے ہیں کہ ایک گہری سازش کے تحت پاکستان کو خونریزی کی طرف دھکیلا جارہا ہے پاکستان کو عراق وافغانستان جیسے حالات سے دوچار کرنے کی مذموم کوششیں کی جارہی ہیں۔ سانحۂ جامعہ حفصہ کے بعد شمالی وزیرستان امن معاہدے کے حوالہ سے اعلیٰ امریکی عہدیداروں کے جو بیانات سامنے آئے ہیں یا مسلسل آرہے ہیں۔ کیا وہ ان مخلصین ومحبِ وطن لوگوں کے بیان کردہ خدشات کی تصدیق نہیں کرتے کہ روشن خیالی، اعتدال پسندی کا ایجنڈا محض ایک گمراہ کن اعلامیہ ہے اور اس کی آڑ میں پاکستان کی مذہبی، سیاسی، سماجی، معاشرتی اقدار ہی تبدیل کرنا مقصود نہیں بلکہ اس علاقہ کا پورا جغرافیہ بدلنے کی سازش پر عمل درآمد بھی ہورہا ہے۔ انتہاپسندی اور روشن خیالی کے عنوان سے وطن عزیز کو ایک ایسے اجتماعی انتشار کی طرف دھکیلا جارہا ہے جس کا منطقی انجام عراق جیسی سول وار پر ہی منتج ہوگا۔ حالیہ دنوں ملک بھر میں خودکش بم دھماکوں کا تباہ کن سلسلہ یہی ثابت کرتا ہے کہ امریکہ بہادر ہمیں جس نہج تک لانا چاہتا تھا ہم خواہی نہ خواہی ٹھوکرے کھاتے وہاں تک آپہنچے ہیں۔ دوسری طرف اسلام آباد سے تازہ ترین اطلاعات یہ موصول ہورہی ہیں کہ فاتحین لال مسجد وجامعہ حفصہ کی سرخروئی کے بعد اب وہاں سے تباہ شدہ عمارتوں کا ملبہ اٹھایا جارہا ہے۔ ۲۲ر جون کی صبح نشر ہونے والی خبروں میں بتایا گیا ہے کہ اس ملبے میں انسانی کھوپڑیوں، ادھ کٹے بازوؤں اور ٹانگوں کے علاوہ طالبات کے زیر مطالعہ رہتے قرآن مجید اور حدیث وفقہ کی کتابوں کا ایک انبار بھی شامل ہے۔ جسے مختلف مقامات پر ٹھکانے لگایا جارہا ہے۔ سڑکوں پر موجود عوام اور میڈیا کی بڑی تعداد آپریشن سائیلنس کی باقیات کا مشاہدہ کررہی ہے۔ مجھے نہیں معلوم وزارت مذہبی امور نے یہ دل دہلا دینے والے مناظر ٹی وی سکرین پر دیکھے ہیں یا نہیں۔ میں یہ بھی نہیں جانتا کہ ہسپتالوں اور دیگر امدادی سنٹروں میں آویزاں مستند سرکاری فہرستوں میں اپنے لاپتہ پیاروں کے نام ڈھونڈتے ان بدنصیبوں تک بھی یہ اطلاع پہنچی ہے یا نہیں کہ ابھی کئی سوختہ جانوں کے بکھرے وجود اُس ملبے کا حصہ ہیں جسے سی ڈی اے کی گاڑیاں اسلام آباد کے ان گندے نالوں میں پھینک رہی ہیں۔ جہاں ایلیٹ کلاس کے محلات سے نکلتی غلاظت بہتی ہے۔ ہوسکتا ہے اس خاک وراکھ کے ڈھیر میں ملفوف جسموں کے ٹکڑوں میں سے کوئی ایک ان کے پیاروں کا بھی ہو؟ کیا پاکستان کا ایک ادنیٰ شہری جان کی امان طلب کرکے ظلِ الٰہی سے یہ سوال کرنے کی جسارت کرسکتا ہے کہ قرآن مجید کے کتنے نسخے، حدیث وفقہ کی کتنی کتابیں سرکاری فہرستوں میں درج نہ ہونے والی کتنے طلباء وطالبات کی ریزوں میں بٹی بے نام لاشوں کی بے حرمتی کا حساب کون دے گا؟ کیا ان خاک وراکھ بن جانے والے بدقسمتوں کے ساتھ ایسا ناروا مذاق اور بے رحم دل لگی کوئی مناسب طرزِ عمل ہے۔ انسانی حقوق کے علمبردار روشن خیال اعتدال پسند اس بے رحم رویہ کے بارے میں سوچیں یا نہ سوچیں۔ مگر ہم کب سوچیں گے؟